ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید کے فکری زاویے

ڈاکٹر محمد امجد عابد

ABSTRACT:
Dr. Jamil Jalbi is well reputed as a very important critic, researcher and translator. His criticism is fundamentally concerned with sociological and social matters. He puts a critic eye on social life of the modern era. He introduced impartiality and originality with a daring expression in Urdu Criticism. He stresses on contextual realities in his criticism. The purpose of this article is to highlight the impartialism, modern trends and different angles of the criticism of Dr. Jamil Jalbi.

ڈاکٹر جمیل جالبی(۱۹۲۹ء) اُردو تنقید کا ایک اہم نام ہے جس نے گزشتہ نصف صدی کے عرصے میں اُردو تنقید پر گہرے اثرات مرتسم کیے ہیں ۔ ان کے تنقیدی نظریات میں گہرائی، وسعت اور ایک فکری رچاؤ نظر آتاہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحقیق اور ترجمے کے باب میں بھی قابل قدر کام سر انجام دیا ہے۔ لیکن ان کی اصل پہچان تنقید ہی ہے۔ اپنی تنقید کو وہ تخلیق کا درجہ دیتے ہیں اور تنقید ان کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو ایک تخلیق کار کے لیے اس کی تخلیق رکھتی ہے۔ اس حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ:

''تنقید میرے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو شاعر کے لیے شاعری، ناول نگار کے لیے ناول یا ڈارمہ نویس کے لیے ڈرامہ رکھتا ہے ۔ میں تخلیق اور تنقید کو الگ الگ خانوں میں نہیں رکھتا بلکہ دونوں کے ''امتزاج'' کو ضروری سمجھتا ہوں ۔'' (۱(

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید کا اہم موضوع کلچر اور اس کے مسائل ہیں ۔ ان کی پہلی تنقیدی کتاب ''پاکستانی کلچر۔ قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ'' کے نام سے ۱۹۶۴ ء میں منظر عام پر آئی۔ فکری سطح پر ان کا زاویہ نگاہ ایک طرف تاریخ اور فلسفے کے ساتھ مربوط ہے تو دوسری طرف کلچر کے ساتھ ان کا خیال یہ ہے کہ ''ہمارے ادب کے موجودہ بحران کا سبب یہ ہے کہ ہم اپنے کلچر اور تہذیبی روح کو فراموش کر کے مغربی پیمانوں سے اپنے ادب بلکہ پوری زندگی کو ناپتے ہیں ۔ چنانچہ اس بحران سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہم اپنی تہذیبی روح کی بازیافت سے اپنی تخلیقی اور فکری قوتوں کے لیے راہ ہموار کریں ۔ اس دریافت نو سے ہی ایک نئے اور بڑے تخلیقی و تہذیبی دور کا آغاز ہو سکتا ہے۔''(۲(

''پاکستانی کلچر''(۱۹۶۴ء) کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقیدی کتاب ''تنقید اور تجربہ'' (۱۹۶۷ء)منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کے فلیپ پر درج رشید احمد صدیقی کی رائے سے اس کے مضامین کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے:

''اُن (جمیل جالبی) کی تحریر میں نہ صرف عصری ، تہذیبی اور ادبی رجحانات کی معتبر عکاسی بلکہ ان کی فکر انگیز تعبیر و توضیح بھی ملتی ہے...اپنے فکر و نظر، ادبی ذوق اور سلیس و شگفتہ انداز بیان کی بنا پر جدید اردو تنقید نگاروں میں جالبی صاحب ایک ممتاز و منفرد حیثیت رکھتے ہیں ۔''(۳)

اس کتاب میں شامل مضامین کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ یہ مضامین اُن کے اس ماضی سے تعلق رکھتے ہیں جس نے ان کی تربیت و تشکیل کی ہے اور جوان کے اندر زندہ ہے۔

''یہ مضامین وقت کی پگ ڈنڈی پر پڑے ہوئے میرے قدموں کے وہ دُھندلے اور واضح نشان ہیں جن پر گزشتہ پندرہ سولہ سال چل کر میں یہاں تک پہنچا ہوں ۔ یہ نشان میرے ذہنی سفر کو ظاہر کرتے ہیں ۔'' (۴)

ڈاکٹر جمیل جالبی کے یہ مضامین ان کی تنقید کا نقطہ آغاز ہیں ۔ بقول سلیم احمد:''یہ صرف ادبی اورتنقیدی مضامین نہیں ہیں بلکہ انھیں زندگی سے ربط دینے کی کوشش کی گئی ہے اور اس دَور میں جب ادب ادبیت زدہ ہو کر ایک سڑے ہوئے پانی کے تالاب کی طرح بُو دے رہا ہے اس میں زندگی کے آبِ تازہ کی ایک رَو داخل کرنے کی یہ کوشش ہر لحاظ سے مستحسن اور قابلِ تعریف ہے۔''(۵) اس کتاب کے مقدمے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے جدید تنقید کا لائحہ عمل تجویز کرتے ہوئے چار نکات پیش کیے ہیں ۔ یہ نکات تنقید کے حوالے سے ہمہ گیر معنویت کے حامل ہیں ۔

۱۔ کسی کلچر کا زوال اس کے فن کے انحطاط میں ظاہر ہوتا ہے۔ چناں چہ ادب کا موجودہ انحطاط اس بات کی علامت ہے کہ ہمارا نظام خیال سسک سسک کر دم توڑ رہا ہے۔ تخلیقی سرگرمیوں کے لیے ضروری ہے کہ زندہ نظام خیال کی قوت سے اسے دوبارہ قائم کیا جائے۔

۲۔ ادب خلا میں ، تہذیبی تعطل میں ، منجمد نظام خیال کے بوسیدہ دائرے میں تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ تہذیبی قوت کے شدید ضعف کے باعث آج ہمارا ادب معاشرے کے لیے ایک روحانی تجربہ نہیں رہا۔

۳۔ ہمارے تہذیبی تعطل اور بے معنویت کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا کلچر اور اس کے تہذیبی سانچے مغرب کے کلچر کے ہاتھوں اپنی مکمل فنا پر راضی نہیں ہو رہے جس کی وجہ سے ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن'' والی صورت حال در پیش ہے اور سارا سماج انتشار، تضاد ، کش مکش، تصادم اور عدم توازن کا شکار ہے۔

۴۔ اس وقت تاریخ کی نئی تعبیر اور نئے تاریخی شعور کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ ہم ایک دائرے کی تشکیل کر سکتے ہیں جس کا سنگم مغرب اور اپنے کلچر کے گہرے اور وسیع ادراک پر قائم ہو۔

ڈاکٹر جمیل جالبیکی تنقید میں ادبی روایت کی پاس داری اور تخلیق کے ذریعے ذات، فرد اور معاشرے میں در آنے والے اثرات کا گہرا عرفانی مطالعہ اور مشاہدہ جھلکتاہے۔ ان کے نزدیک ادب، انسانی، معاشرتی ، تہذیبی اور مادی زندگی کا اہم اور منفرد اظہار ہے اور اسکا تعلق پوری زندگی کے تجربوں اور خود زندگی کی روح کے اظہار سے ہے۔ ان کے نزدیک ادب کے مرنے یا ختم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ادب کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیب اور اس کی روح بھی مر رہی ہے۔ لکھتے ہیں :

''ہر تخلیقی سر گرمی کے پھول جس میں ادب بھی ایک اہم ترین ذریعہ اظہار ہے، اسکی تہذیب کے درخت میں ہی کھلتے ہیں اور اس کے رنگ و بو، اس کی شکل صورت، اس کی وضع اور ڈھنگ ، اس تہذیب کی روح اور اس کا طرز احساس مل کر متعین کرتے ہیں ۔ اب اگر تہذیب مر رہی ہے تو تہذیب کے سارے سانچے ، ساری تخلیقی سرگرمیاں ، موسیقی، سائنس ، تعمیر، مصوری، کھیل کود ، ادب ، فلسفہ ، ریاضی سب منجمد ہو کر بے جان ہونے لگیں گے۔'' (۶(

عصری آگہی کے بغیر بڑا ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔اپنا زمانہ اور اس کی روح، ماضی کا ورثہ ، یعنی روایت اور آنے والے زمانے کی روح کے شعور سے ہی تخلیق کی روح بیدار ہوتی ہے۔ عصری آگہی سے مراد وہ طرز احساس ہے جو معاشرتی اور سماجی تغیرات کے نتیجے میں تخلیق کار کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے اور بالواسطہ طور پر نقاد کے زیربحث آتا ہے۔ عہدِ حاضر کے اپنے شدید اور فوری تقاضے ہوتے ہیں جن کو سمجھے بغیر یا ان سے لا تعلق رہ کر ادیب ادب کی پرورش نہیں کر سکتا۔ جمیل جالبی کے ہاں بھی عصری آگہی کی جھلکیاں اُن کی تنقیدات کے آئینے میں اتنی نمایاں ہیں کہ ہم ان کی بے لاگ اور غیر جانبدارانہ تنقید کی کاٹ دار دھار کی شدّت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بلاشبہ ان کی تنقید ادب اور اس کی موجود صورت حال اور اس کے تناظر میں ادبی روایت کے تسلسل اور مستقبل میں اس کے اثرات تک جاتی ہے اور ہمیں یہ باور کراتی ہے کہ اگر ادب اور اس کی تخلیقات اور تنقیدات میں عصری آگہی کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر نہ رکھا جائے گا تو ادب اور تخلیقات کا مستقبل مخدوش ہے۔ اپنے مضمون ''نیا ادب اور تہذیبی اکائی'' میں وہ اس حوالے سے بڑی دلسوزی سے رقم کرتے ہیں :

''جب میں عہد حاضر کے اردو ادب اور ادیبوں کا خیال کرتا ہوں تو معاً مجھے اس بڑے سے غبارے کا دھیان آتا ہے جس کی ہوا نکل گئی ہو اور وہ میلی کچیلی دھجی کی مانند کسی بچے کے ہاتھ میں لٹک رہا ہو۔ اب اس غبارے کا استعمال یہ ہے کہ بچے اپنے منہ سے چھوٹے چھوٹے غبارے بنائیں اور ہاتھ پہ رکھ کر پٹاخے سے پھوڑیں تاکہ گھر والے چونک جائیں اوربچے مزا لیں ۔ گزشتہ چار پانچ سال سے اردو ادب کے ادیب یہی کھیل کھیل رہے ہیں ۔ ارد و ادب کو دیکھیے تو فقرے بازی کی ہوا سے ننھے ننھے غبارے بنا کر پٹاخ پٹاخ کی آوازوں سے سنسنی پھیلائی جا رہی ہے اور اس عمل کو نئے ادب کا نام دیا جا رہا ہے ۔ ادب سے سنجیدگی غائب ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے اردو ادیبوں کے سامنے فکر و عمل کا کوئی سنجیدہ مسئلہ باقی نہیں رہا۔'' (۷(

عصرِ حاضر کی معروضی صورت حال کے تناظر میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی یہ تنقید ان کے بھر پور عصری شعور کی آئینہ دار دکھائی دیتی ہے ۔ تخلیقات کے ادبی مقام کے تعین اور ان کے مستقبل

کے بارے میں ان کی بے لاگ تنقید نے ادب اور اس کے مسائل کے بارے میں ان کے نقطہ نظر کا جس انداز میں اظہار کیا ہے آج بھی ہم اس کے آئینے میں اس عصری شعور کی کار فرمائی کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں ۔

ادب زندگی کا اظہار ہے ۔ ادب معاشرے کی ظاہر و باطن کا آئینہ ہے جو کچھ معاشرے میں ہو رہا ہے ، جو کچھ معاشرے پر گذر رہی ہے ادیب کی تحریر اس کا احاطہ کرتی ہے۔ جہاں معاشرہ آنکھ اور کان بند کیے برسوں بعد شعر کی منزل پہ پہنچتا ہے وہاں اس معاشرے کا ادب بہت پہلے اس احساس کا اظہار کرنے لگتا ہے اس لیے وہ معاشرہ جو اپنے مفکر ادیبوں کی تحریریں پڑھتا رہتاہے زندہ اور بیدار رہتا ہے ۔ڈاکٹر جمیل جالبی اسی باعث ادب کو وہ واحد وسیلہ گردانتے ہیں جس کے ذریعے کوئی بھی معاشرہ حقیقی روح کی دریافت اور بازیافت کرتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقیدی کتاب ''نئی تنقید'' ۱۹۸۵ ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں نئی تنقید کے حوالے سے ان کا موقف یہ ہے کہ تنقید کا ایک کام تو یہ ہے کہ وہ فکر کی تشکیل نو کرے اور اُسے پوری زندگی پر پھیلا دیا جائے تاکہ تجزیے ، مطالعے اور غور و فکر کے بعد فکر و احساس کی جڑ یں صحیح قسم کی زندگی میں تلاش کی جا سکیں ۔ صحیح قسم کی زندگی سے مراد وہ نظام اقدار و معیار ہے جس کے حوالے سے معاشرے کی اجتماعی زندگی میں ایسی روح پھونکی جا سکے کہ تخلیقی جوہر زندگی کے ہر شعبے میں نشو و نما پانے لگے ۔ تخلیقی جوہر ہر معاشرے کی حقیقی زندگی کے لیے وہی کام کرتا ہے جو جسم میں روح کرتی ہے۔ (۸) اس تناظر میں ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے عہد کی تخلیقات اور تنقید سے سخت مایوس ہیں ۔ تخلیقات کے بارے میں تو ان کا کہنا ہے کہ آج ادبی تخلیق کے نام پر کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگ گیا ہے۔ ہر شاعر، افسانہ و ناول نگار کے سر پر عظمت کا بھوت سوار ہے اور وہ بزعم خود خود کو عظیم اور عظیم تر تصور کرتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تنقید اپنے منصب کو فراموش کر چکی ہے ۔ تنقید کے لیے تخلیقی جوہر کا وجود اتنا ہی ضروری ہے جتنا تخلیقی عمل کے لیے تنقیدی شعور ضروری ہے۔ عصرِ حاضر میں تنقید کے منصب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''۱۔وہ (تنقید)ان بیماریوں کو سامنے لائے جو غلط اقدار کو اختیار کرنے سے ہماری اجتماعی زندگی میں پیدا ہو گئی ہیں ۔

۲۔ دوسرے ان بیماریوں کی الگ الگ تشخیص کر کے ان کا علاج دریافت کرنا بھی تنقید کا کام ہے۔

۳۔تیسرے اپنی تاریخ، اپنی روایت کے حوالے سے ان بنیادوں کو تلاش کرنا بھی تنقید کا کام ہے جن پر نئے نظامِ خیال کی عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔'' (۹(

ڈاکٹر صاحب کے خیال میں ہمارا تخلیق کار اس گہرے تنقیدی شعور سے عاری ہو چکا ہے ۔ اس طرح ہمارا نقاد بھی ادبی روایت اور ادبی فکر کو سوائے دہرانے اور چبائے ہوئے لقموں کو چبانے کے علاوہ کچھ نہیں کر رہا۔ ان کے خیال میں ادب کی بحرانی کیفیت اور تخلیق کی بے جہتی اور بے سمتی کی وجہ یہی ہے کہ ہماری تنقید اپنے دور کے ادب کو جہت اور بنیاد فراہم کرنے میں ناکام رہی

ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہم بغیر سمت اور بغیر مقصد کے زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ ہمارا ادب، ہماری فکر، ہمارا فن، ہماری سیاست، ہماری معاشرتی و تہذیبی زندگی سب بے جہت اور بے مقصد ہو گیے ہیں ۔ ان کے خیال میں صحت مند معاشرے صرف حصولِ زر سے نیک نام نہیں ہوتے بلکہ ان اقدار ومعیار سے نیک نام ہوتے ہیں جنھیں حاصل کرنے کی جد و جہد میں وہ مصروف ہوتے ہیں اور جن کا اظہار ان کا ادب و فن کرتاہے ۔ اس عمل سے زندگی میں ہر دَم نئے معنی پیدا ہوتے رہتے ہیں ۔ ادب زندگی کی روح کا اظہار ہے۔ زندگی ہی ادب کا خام مواد ہے۔ اس لیے غلط رجحانات کی نفی کرنا اور ان کے بجائے مثبت رجحانات اور رویّوں کو آگے بڑھانا بھی آج کی تنقید کا کام ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اسے نئی تنقید کا نام دیتے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب نے نئی تنقید کے حدود اور فکر و معنی کی سطح پر اس کے نئے دائرہ کار کا تعین کرنے کے بعد ایک الگ مضمون میں تنقید کا منصب بیان کیا ہے۔ نئی تنقید کے منصب کی تلاش میں وہ مختلف علوم و نظریات کے زیر اثر تنقید کی مختلف صورتوں کا مطالعہ کرتے اور یہ دیکھتے ہیں کہ اِن سے ادب کے مطالعے میں کیا مدد ملی ہے؟ مثلاً تنقید کی مختلف صورتوں ، یعنی محض سماجی حوالے سے یا محض نفسیاتی حوالے سے یا محض جمالیاتی ، تاثراتی یا سوانحی حوالے سے کسی ادب پارے کامطالعہ محدود اور یک رُخا ہوتا ہے۔ اِسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ ایک ادب پارے کو ہر رُخ سے دیکھا جائے۔ اُن کے خیال میں ایسے نقاد ادب کے مطالعے کو غلط راستے پر ڈال دیتے ہیں جو یک رخی تنقید کو اپنی انفرادیت اور پہچان بنا لیتے ہیں ۔ ایسا کر کے وہ کسی ایک پہلو میں تخصیص تو حاصل کر لیتے ہیں اور سماجی یا نفسیاتی نقاد کے طور پر مشہور تو ہو جاتے ہیں لیکن اس سے مطالعہ ادب کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے۔ یہاں ڈاکٹر جمیل جالبی اس نکتے کو بیان کرتے ہیں جو نئی تنقید کے منصب کی وضاحت کر دیتا ہے۔ ان کے خیال میں :

''اس وقت تنقید کو ایک ایسے ''فطری امتزاج''کی ضرورت ہے جو تنقید میں بیک وقت نئی سطحوں کو جذب کر کے اسے ایک وسیع تر متوازن صورت عطا کر دے۔ ''یہی امتزاج'' نئی تنقید کا منصب ہے۔'' (۱۰(

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ امتزاج ، فکر و فلسفہ، ادبی تاریخ اور کلچر کی سطح پر ممکن ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک فکر و فلسفہ کا ادب اور ادبی تنقید سے وہی تعلق ہے جو روح کا جسم سے ہوتا ہے ۔ چناں چہ کوئی ادیب فکری اساس ، تاریخی شعور اور زندگی سے براہِ راست وابستہ ہوئے بغیر تخلیقی توانائی کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اس لیے نئی تنقید کو عہدِ حاضر کے تعلق سے اس فکری اساس کو تلاش کرنا ہے ۔ اس طرح ادبی تاریخ قدیم اور جدید ادب کو نہ صرف یکساں اہمیت دیتی ہے بلکہ اپنے دَور کے حوالے سے انھیں نئے معنی بھی دیتی ہے ۔ اور یہ سارا کام وہ اس طرح انجام دیتی ہے جس سے ادب کی ایک واضح تصویر سامنے آجاتی ہے ۔ نئی تنقید کا حقیقی امتزاج اسی طرح پر ہو سکتا ہے ۔ یہاں ہر رُخ ، ہر پہلو، ہر زاویہ اور علم، فکر کلچر، لسانیات، تحقیق ، سماجی و جمالیاتی زاویے سب مل کر ایک وحدت کی صورت اختیار کر جاتے ہیں اور ادب کی حقیقی روح سامنے آ جاتی ہے۔ ''امتزاج '' کی تیسری سطح کلچر کی سطح ہے۔ اگر تنقید کلچر کی سطح پر امتزاج

کے عمل سے گزرے تو اس کے اندر بھی وسعت اور کلچر کی طرح تہ داری پیدا ہو سکے گی اور یوں تنقید اس یک رُخے پن سے محفوظ رہ سکے گی جس کا وہ اب تک شکار ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیال میں کلچر ہی ایک ایسی سطح ہے جس پر تنقید میں بیک وقت سماجی، نفسیاتی، جمالیاتی، روایتی، فکری اور تخلیقی اقدار کا امتزاج ہوتاہے۔ کلچر پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے اور بڑا ادب بھی ساری زندگی کی روح کا اظہار کرتا ہے ۔ اس لیے اسی سطح پر تنقید سنجیدہ ، تہ دار اور دانش ورانہ سر گرمی بن کر معاشرے کی تخلیقی قوتوں کی نشو و نما اور راہ نمائی کرنے لگتی ہے۔ یہی تنقید کی تخلیقی سطح ہے اور یہی نئی تنقید کا منصب ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جدیدیت کے اہم موضوع کو بھی اپنے دائرہ تنقید میں شامل کیا ہے۔ جدیدیت پر بہت سے نقادوں نے لکھا ہے اور اس پر طویل بحثیں کی ہیں ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا موقف یہ ہے کہ جدیدیت ایک اضافی چیز ہے اور اس کا تعلق کسی لمحہ کسی خاص زمانے یا دَور سے ہوتا ہے۔ آج کی جدیدیت کل پرانی ہو جائے گی جو آج جدید ہے وہ کل قدیم ہو جائے گا۔ ان ہی معنی میں ہر جدید میں قدیم شریک رہتا ہے۔جدیدیت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

’’ہر نسل کے ایسے معیاروں اور پیمانوں کو ، جن سے وہ اپنے دور اور ماضی کو دیکھتی اورن اپتی ہے، ہم جدیدیت کا نام دے سکتے ہیں ۔ ان معیاروں میں نظام خیال بھی، جس پر معاشرے کا ڈھانچہ اور روح قائم ہے شامل ہے۔ اور اس نسل کے رویے، اندازِ فکر اور طرزِ احساس بھی۔‘‘(۱۱(

ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیال میں سائنسی اندازِ فکر کو اپنے شعور اور طرزِ احساس کا حصہ بنا کر ہم جدیدیت کی تلاش کر سکتے ہیں ۔ ان کے خیال میں جدیدیت صنعتی معاشرے کے ہر دم بدلنے والے مزاج کا منطقی نتیجہ ہے۔ یہ اضافی چیز تو ہے لیکن کوئی ہوائی عمل نہیں ہے بلکہ یہ ایک مخصوص نظام کی قبولیت سے وجود میں آیا ہے۔ یہ مخصوص نظام مغرب سے در آمدہ ہے جسے قبول کیے بغیر ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ ادب میں بھی جب کوئی جدیدیت کی آواز اٹھاتا ہے تو مغرب ہی سے رجوع کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ، اس بات پر آزردہ نظر آتے ہیں کہ ہماری جدیدیت ہمارے کلچر کے زوال کی علامت ہے اور کسی کلچر کا زوال قدرتی طور پر اس کے فن کے انحطاط میں ظاہر ہوتا ہے۔ ادب کا موجودہ انحطاط اور سماج کا تہذیبی تعطل و انتشار اس بات کی علامت ہے کہ ہمارا نظام خیال جاں کنی کی حالت میں سسک سسک کر دَم توڑ رہا ہے۔ پرانے تہذیبی سانچے اور طرزِ احساس اپنے معنی کھو رہے ہیں ۔ معاشرے کی خواہشات اور تہذیبی اقدار، ایک دوسرے سے متصادم ہیں ۔ سارے تہذیبی رشتے بکھر رہے ہیں ۔ چناں چہ تخلیقی سرگرمیوں کے لیے ضروری ہے کہ زندہ نظام خیال کی قوت سے اسے دوبارہ قائم کیا جائے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقیدی کتاب ’’معاصرِادب‘‘ (۱۹۹۱ء)کے نام سے منظر عام پر آئی جو ان کے ادبی، تنقیدی اور فکری مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں انھوں نے ادب کی صورتحال ، صحیح ادبی رویہ، شاعری اور مسائل حیات، ادب اور جمہوریت اور مختلف شعرا کی شاعری اور نثر نگاروں کی نثر کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ادب کی موجودہ صورتحال کا بڑے تفکّر سے جائزہ لیتے ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ آج ہم ذہنی و فکری سطح پر بے سمت اور بے جہت ہیں ۔ اور ادب

مہمل بے مقصدیت کا شکار ہے ۔ وہ فرد اور معاشرے میں شعور پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ایسا شعور جس سے فکری زندگی کا بیج پھوٹتا ہے۔ ادب اور ادیب کی صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں :

''حیرت کی بات یہ ہے کہ معاشرے میں انسانی و معاشرتی اقدار، صداقتوں کی تلاش اور زندگی کی معنویت دریافت کر نے کی کوشش بھی نظر نہیں آتی۔ ہمارا ادب اجتماعی رشتوں سے کٹ گیا ہے اور ادیب تخلیق کے کرب میں مبتلا رہنے کے بجائے آسائش کے لطف کی تلاش میں دن رات سرگرداں ہے۔ یہی مقصدِ اولیٰ ہے اور ادب اسی کے حصول کا ذریعہ ہے۔''(۱۲(

ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ ادب اپنا فرضِ منصبی ادا نہیں کر رہا۔ کیونکہ ادب تو زندگی کے دھارے پر بہتے ہوئے سچائیوں کے اظہار سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی ادب زندگی ا ور اس کی سچائی کا اظہار کرتا ہے۔ مگر ہمارے ادب میں یہ رویہ مفقود ہے۔ ہمارا ادیب تعلقات عامہ کے راستے پر چل پڑا ہے۔ اس کا مطمع نظر فکر و خیال نہیں بلکہ زندگی کی آسائیشیں اور معاشرتی رتبہ حاصل کرنا ہے۔ ایسی صورت حال میں ایسا ہی ادب تخلیق ہو گا جیسا کہ ہو رہا ہے۔ ڈاکٹرجمیل جالبی ادب کو آزادی اظہار کا وسیلہ خیال کرتے ہیں اور ادب جبر و استحصال ، جاگیر دارانہ ذہنیت اور جاگیر دارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھا سکتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس میں یقینا کوئی نہ کوئی خامی ہے۔ بقول ان کے ''جمہوریت اور ادب ساتھ ساتھ چلتے اور ایک دوسرے کو مستحکم کرتے ہیں ۔ ادب بغیر جمہوریت کے مرجھایا ہوا پھول ہے اور جمہوریت بغیر ادب کے ایک بنجر ریگ زار ہے۔''(۱۳) یہاں جمہوریت سے ڈاکٹر صاحب کی مراد کوئی حکومت نہیں ہے بلکہ ان کی مراد ایک طرز حیات اور ایک اندازِ فکر ہے جس میں ذات کو فنا کر کے اجتماعی روح کو اہمیت دی جاتی ہے۔ جس میں تعصبات سے بالا تر ہو کر لوگوں کی باتوں کو تحمل اور بردباری کے ساتھ سنا جاتا ہے۔ اپنی طبقاتی یا علاقائی فکر کو دوسروں پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی جاتی ۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارا معاشرہ بنیادی طور پر جاگیردارانہ معاشرہ ہے اور آج تک اسی ذہنیت کا مالک ہے۔ ایسے حالات میں ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرتی انسان جن جن چیرہ دستیوں اور جبر و استحصال کا شکار ہوا ہے ان دردناک کہانیوں کو ادب کا موضوع بنا کر ایک نئے شعور کو جنم دیا جائے جس سے نہ صرف جمہوریت پروان چڑھے بلکہ مزید مستحکم بھی ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :

''جمہوریت عوام کو ابھارتی، اٹھاتی اور ان کی پرورش کرتی ہے۔ اور ادب عوام کے مسائل ، ان کے جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہے اور یہی اظہار معاشرے میں اس شعور کو پیدا کرتا ہے جس سے خود جمہوریت جڑ پکڑتی اور ارتقاء کی منزل سے گزرتی ہے۔ ادب کا کام اپنے معاشرے کی جڑوں کو سیراب کرنا ہے... اسی احساس سے وہ شعور پیدا ہوتا ہے جو ادب کا کام اور مقصد ہے اور جو جمہوریت کے لیے تازہ ہوا کا درجہ رکھتا ہے۔'' (۱۴(

اس اقتباس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے جو ذہن انسان کو تبدیل کرے اور اسے عمل کی طرف رجوع کرے تاکہ ادب عوام اور جمہوریت کی روح کا ترجمان بن جائے ۔ ادب اور ادیب کو عہدِ حاضر کے تعلق سے جمہوریت کو پروان چڑھانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید جدید عہد میں ایک نئے تہذیبی ، فکری اور معاشرتی تناظر میں ادب کے نئے مفاہیم کی جانب اشارے دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب روایت کے خلاف نہیں بلکہ وہ جدید قدروں کے ظہور کے ساتھ ساتھ روایت کے رواجوں کو بھی ساتھ لے کر چلتے ہیں ۔ ان کی تنقید کا اہم پہلو یہ ہے کہ انھوں نے ادب کے سماجی تناظرکو ہمیشہ نگاہ میں رکھا ہے۔ اور زمانے اور وقت کے ساتھ رونما ہونے والی تبدیلیوں کا احساس کر کے ادب کے دھارے کا رُخ بدلنے کی طرف توجہ بھی دلاتی ہے۔ ان کے یہاں عصری آگہی اور عصری شعور، دیگر ادیبوں اور نقادوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ انھوں نے زیادہ تر تنقید لکھی ہے یا تحقیق کی کوچہ گردی کی ہے۔ شاعری سے محض سننے اور پڑھنے تک تعلق رکھاہے۔ وہ سنجیدہ نقادوں کے حلقے میں عزت اور احترام سے دیکھے جاتے ہیں ۔ ان کے یہاں نظری تنقید نے پایہ ٔ اعتبار حاصل کیا اور ڈاکٹر جمیل جالبی کو ایسے نقادوں کی قطار میں لا کھڑا کیا جن کی کہی ہوئی ہر بات کا وزن ہوتاہے اور وہ اہل فن کے نزدیک ثقہ ٹھہرتی ہے۔

حوالہ جات:

)۱(جمیل جالبی، ڈاکٹر، نئی تنقید، مرتبہ :خاور جمیل، کراچی: رائل بک کمپنی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۰

)۲(ضیاء الحسن، ڈاکٹر ، اُردو تنقیدکا عمرانی دبستان، لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۲۰۰۶ء، ص ۴۰۲،۴۰۱

)۳(رشید احمد صدیقی، تنقید اور تجربہ، بار اول، از ڈاکٹر جمیل جالبی، لاہور: یونیورسل بکس، ۱۹۶۷ء ، فلیپ

)۴(جمل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تجربہ، بار دوم، لاہور: یونیورسل بکس، ۱۹۸۸ء، ص ۹

)۵(سلیم احمد، ''فلیپ''، تنقید اور تجربہ،از ڈاکٹر جمیل جالبی، لاہور: یونیورسل بکس،۱۹۶۷ء، فلیپ

)۶(جمیل جالبی ، ڈاکٹر، تنقید اور تجربہ، بار دوم، ص ۱۸

)۷(ایضاً، ص ۳۵

)۸(جمیل جالبی، ڈاکٹر، نئی تنقید، ص ۲۸۴،۲۸۳

)۹(ایضاً، ص ۲۰،۱۹

)۱۰(ایضاً، ص ۴۷

)۱۱(ایضاً، ص ۸۰،۷۹

)۱۲(جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۶

/...../